بدیہ تبریک

میں جنرل اختر عبدالرحمٰن سے ذاتی طور پر واقف نہ تھا۔ ایک یا دو مرتبہ سرکاری تقاریب میں رسمی سی ملاقات ہوئی تھی۔ جنرل ضیاالحق کیوں کہ مجھے عزیز رکھتے تھے اور میں بھی ان کے اخلاق، کردار اور صلاحیتوں کا قدر دان تھا، اس تعلق سے میں بھی موانست کے جذبات رکھتا تھا۔ دونوں دوستوں اور ان کے قریب ترین ساتھیوں کی شہادت کے بعد جب بکھرے ہوئے حقائق کا یکجا کیا اور افغانستان میں روسی فوجوں کے داخلہ سے لے کر ان فوجوں کے انخلا تک کے تقریباً آٹھ برس کا جائزہ لیا تو از خود ہی بے شکار حیرت انگیز انکشافات ہوئے اور اس میں ان دونوں شہدا کی مساعی اور اشتراک عمل کے بعض عجیب وغریب گوشے وا ہوئے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جنرل اختر عبدالرحمٰن کی شخصیت سے ان کی زندگی میں پوری طرح متعارف نہ ہونے کا اب بہت ملال ہوتا ہے۔ ان کی شہادت کے بعد ان کے صاحب زادے عزیزی ہمایوں اختر سے ملاقات ہوئی۔ قد وقامت، شکل وصورت، طور اطوار غرضیکہ ہر طرح جاذب نظر شخصیت، مسکراتا ہوا چہرہ اور ملنے جلنے میں گرم جوشی اور اپنائیت، پھر اعلیٰ تعلیم وتربیت سے آراستہ، خدا ترس اور نیک چلن، منکرات سے اجتناب اور دینی احکام کی پابندی کرنے والے اس نوجوان سے مل کر اور بھی زیادہ احساس ہوا کہ بیٹے سے مل کر اگر اتنی خوشی ہوئی ہے تو باپ سے مل کر کس قدر فرحت ہوتی۔ معلوم ہوا کہ اختر عبدالرحمٰن کا سارا گھرانا اور اولاد ایسی ہی خوش جمال اور خوش فعال ہے۔ جو شخص اپنے پیچھے ہونہار، نیک اور خوش خصلت اولاد چھوڑ جائے، پھر اسے یہ حاجت نہیں رہتی کہ اس کی نیک نامی اور تحسین کے لیے سرکاری انتظامات کیے جائیں یا اس کے نام سے شہر اور عمارتیں، ریل گاڑیاں اور سڑکیں موسوم کی جائیں ''مشک آن است کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید''

ساری دنیا میں ایک معقول طریقہ یہ ہے کہ ایسے لوگ جنہوں نے اپنی زندگی کسی اعلیٰ مقصد کے لیے وقف کر دی ہو، وہ اگر اس مقصد کو حاصل نہ بھی کر سکے ہوں، تو انہیں ان کی کوششوں، ان کے ایثار، ان کے خلوص کے تعلق سے یاد رکھا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے ملک کی بے اعتبار اور سوگوار تاریخ میں اس تہذیبی رکھ رکھاو سے برابر انحراف کیا جاتا رہا ہے۔ یہاں مرحومین کو بڑی آسانی اور بددیانتی کے ساتھ معتوبین قرار دے دیا جاتا ہے۔ جب مرنے والا اپنے بارے میں کچھ بتانے، کچھ سنانے کے قابل نہیں رہتا۔ جب اس کا سارا حساب کتاب اللہ کی بارگاہ میں ہی کیا جانا مقرر ہوتا ہے، تب نئے اہل اختیار اور ارباب اقتدار اور اس پر نام دھرنے اور الزام تراشیاں کرنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ یہ نئے آنے والے، جانے والوں کو بدنام وخوار کر کے خود نیک کام ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کارناموں اور خدمات کو، جو جانے والوں نے وطن اور اہل وطن کے لیے انجام دی ہوتی ہیں، فراموش اور مسخ کرنے کی سعی لاحاصل میں اپنی تمام توانیاں اپنے تمام وسائل ضائع کرتے ہیں۔ لیکن اللہ کا نظام ایسا اٹل اور بے لاگ ہے کہ جو دوسروں کا برا چاہتے ہیں، وہ خود بھی اچھائیاں سمیٹ نہیں پاتے اور جو دوسروں کی خوبیاں ڈھونڈتے اور ان کا اعتراف کرتے ہیں، خود بھی معاشرے میں سرخرو ہوتے ہیں اور معاشرہ کو شاد وآباد کرتے ہیں۔

قوموں کا بھی یہی حال ہے، جو اقوام اپنے مشاہیر اور نابغہ ہائے روزگار کے کارناموں اور خدمات کی قدر کرتی ہیں۔ اسلاف کے نام اور کام کو یاد کر کے فخر سے اپنا سر بلند کرتی ہیں، وہ ہمیشہ سرفراز رہتی ہیں۔ ان کے جانے والے جو کام ادھورا چھوڑ کر جاتے ہیں، آنے والے اسے احسن طریقہ پر پورا کرتے ہیں۔ نئے کارنامے انجام دیتے ہیں۔ اعلیٰ اقدار کی پاس داری کرتے ہیں۔ اچھی روایات کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ایسی قومیں متواتر کارہائے نمایاں انجام دیتی رہتی ہیں۔ اس لیے وہ پسپا اور نامراد نہیں ہوا کرتیں۔ اس شکر کا ایک معروف طریقہ یہ ہے کہ وہ بڑی بڑی نعمتوں اور برکتوں کو نظر انداز کر کے چھوٹی چھوٹی مایوسیوں اور محرومیوں کا رونا نہیں روتی رہتیں۔ وہ اعلیٰ مقامات کی متلاشی ہوتی ہیں اور اگر توفیق ہو اللہ پر بھروسہ کر کے اور توفیق نہ ہو تب بھی خود اعتمادی کے ساتھ ان تک پہنچنے کی سعی کرتی ہیں۔ اسی لیے ان کا یہ مقدر نہیں ہوتا کہ ان کے ادنیٰ مفادات بھی ان کے لیے عذاب بن جائیں۔ وہ اپنے ادنیٰ مفادات کی خاطر اقوال و افعال کی تمام معقول احتیاطوں کو بالائے طاق نہیں رکھ دیتیں۔

1980ء کے اوائل سے 1988ء تک کے عرصے میں پاکستان اپنی تاریخ کے ایک عجیب و غریب دور سے گزرا ہے۔ اس دور میں بہت سی باتیں، بہت سی واقعات، بہت سی شخصیات بوجوہ بہت متنازعہ رہی ہیں۔ ان متنازعہ جزئیات اور شخصیات کے بارے میں تاریخی فیصلہ کا تو ابھی کافی عرصہ انتظار کرنا پڑے گا، لیکن جیسا کہ ہم سب نے دیکھا اس عشرہ میں پاکستانی آرمی کو جو قیادت حاصل رہی، وہ اپنی سمجھ بوجھ، پیشہ ورانہ لیاقت اور ہنرمندی، وسعت نظر اور تدبر کے اعتبار سے بہت ممتاز اور حیرت انگیز طور پر باصلاحیت افسران پر مشتمل تھی۔ یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ یہ اعلیٰ افسران اپنے پیش رو افسران کے مقابلہ میں بالکل دیسی تہذیب اور خالص پاکستانی ذہنیت رکھنے والے افسران تھے۔ نہ ان پر سنڈھرسٹ کی چھاپ تھی، اور نہ یہ برطانوی راج کے اثرات کی تصویر تھے۔ ان کی ذہنی تربیت اور کردار کی تعمیر پاکستان میں ہوئی تھی اور اسی سرزمین اور یہیں کے ماحول میں انہوں نے جو بھی تجربات حاصل کیے تھے، انہی تجربوں اور مشاہدات کی روشنی میں انہوں نے اپنے فکر و فلسفہ، اپنے مزاج اور عادات کو سنوارا اور پختہ کیا تھا۔ ان کی نظریاتی اساس، ان کا دین اور ان کا تشخص اسلام اور پاکستان تھا۔

ان اعلیٰ افسروں میں جنرل ضیاالحق، جنرل اختر عبدالرحمٰن، جنرل رحیم الدین، جنرل خالد محمود عارف کا تعلق 1980ء کے عشرہ میں راہ راست پاکستان کے نظم و نسق اور اس کی قومی زندگی کے بارے میں حکمت عملی تیار کرنے اور فیصلے کرنے سے تھا۔ یہ آپس میں ایک دوسرے کی فکر و عمل سے مکمل طور واقف تھے اور ایک دوسرے کے خیال اور موقف کو نہ صرف پوری طرح سمجھنے کے اہل تھے، بلکہ آزادانہ اور بے تکلفانہ ایک دوسرے سے تبادلہ خیال کر کے معاملات اور مسائل کے بارے میں لائحہ عمل کی تفصیلات مرتب کرنے پر بھی قادر تھے۔ جنرل محمد ضیاالحق جو صدر مملکت ہونے کے علاوہ فوج کے چیف آف آرمی سٹاف بھی تھے، کسی بھی نتیجے پر پہنچنے سے قبل اپنے ان تین ساتھیوں سے الگ الگ یا مشترکہ طور پر مشورہ کرتے تھے۔ چنانچہ نظم و نسق، عسکری تنظیم، خارجہ پالیسی، دفاعی حکمت عملی میں محمد ضیاالحق مرحوم کو جو بھی کامیابی ہوئی، اس میں یہ حقیقت ان کے لیے بہت سازگار رہی کہ انہیں کم از کم ایسے ساتھی میسر تھے، جن کے سامنے وہ اپنا دل کھول سکتے تھے اور جن کے دلوں میں وہ جھانک کر دیکھ سکتے تھے۔ اس کی بڑی وجہ ان کی تہذیبی، فکری اور نظریاتی یک رنگی تھی۔

میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اختر عبدالرحمٰن کے اشتراک سے جنرل محمد ضیاالحق نے وہ کارنامہ انجام دیا تھا، جس کی تکمیل میں اب جتنا بھی وقت لگ رہا ہے، اس سے ساری دنیا پر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوتی جا رہی ہے کہ یہ دونوں شہدا کتنے باصلاحیت تھے اور ان کے بعد میں آنے والے برابر خود کو کس قدر ناکارہ ثابت کر رہے ہیں۔ یہی افغانستان کا مسئلہ تھا کہ جہاں روس جیسی عظیم اور خوفناک طاقت اپنا عسکری قبضہ اور اقتدار

منوانے کا عزم لیے موجود تھی۔ یہی بھارت تھا، جہاں اندرا گاندھی جیسی آگ اور خون سے کھیلنے والی حکمران ساری دنیا میں اپنا لوہا منوا چکی تھی، اور مشرق وسطیٰ سے جنوبی ایشیا تک یعنی میدا غاسکر سے آبنائے لاکا تک کے سارے علاقہ پر تسلط کی خواہاں تھی۔ یہی ایران اور عراق تھا، جو برسر پیکار تھے، اور دونوں ہی برادر اسلامی ممالک سے ربط وخلوص قائم رکھنے کا مسئلہ تھا۔ یہی دنیائے اسلام تھی، جس میں حرم کی پاسبانی کے لیے مسلمانوں کو یکجا رکھنے کے خواب کو حقیقت بنانے کی کوششیں درکار تھیں۔ یہی جنوبی ایشیا کے ممالک تھے، اور بھارت کی طاقت اور نخوت کا ہمیں سامنا تھا۔ یہی امریکہ تھا، جہاں سرد وگرم چشیدہ صدر ریگن وقت کے سب سے بااختیار فرماں روا کی حیثیت سے وہائٹ ہاوس میں رہایش پذیر تھے۔ جو لوگ 1980ء کے عشرہ کو اپنی کمزور یادداشت یا سفاک عصبیت کی وجہ سے فراموش نہیں کر چکے ہیں، بلکہ جنہیں یہ یاد ہے کہ افغانستان میں روسی فوجیں کس طرح داخل ہوئیں، اور برزنیف سے گورباچوف تک روسی سربراہوں اور ان کے وزرا، سفرا، اور جرنیلوں نے پاکستان کو ڈرانے، دھمکانے، تنگ کرنے، پاکستانی قوم کی نفسیات کو مجروح اور ذہن کو تذبذب اور پراگندگی کا شکار کرنے اور پاکستان میں خود پاکستانی سیاسی عناصر کے ساتھ مل کر تخریب کاری، دہشت گردی اور انتشار کیسے وسیع پیمانہ پر برپا کیا، وہ 1988ء میں روسی فوجوں کے افغانستان سے انخلا کے واقعہ کی تاریخی، عسکری اور بین الاقوامی اہمیت کا کسی حد تک اندازہ لگا سکتے ہیں،

عام حریت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے
اے مسلماں آج اس خواب کی تعبیر دیکھ

کہا تو یہ گیا تھا کہ ''آپ ایک سپر پاور کو سزا نہیں دے سکتے'' اور جس وقت اخباری اور سیاسی حلقوں میں یہ فقرہ سنا گیا، تو اسے ایک نہایت مدبرانہ اور بامعنی مقولہ کے طور پر دانایان عالم نے اٹھتے بیٹھتے دہرایا؛ کیا پاکستان اور کیا پاکستان کی فوجی قوت اور قومی وسائل، لیکن وہ جو شاعر مشرق نے کہا تھا، وہ اس چلتے ہوئے فقرہ سے زیادہ بامعنی اور بلیغ تھا،

خودی بلند تھی اس خوں گرفتہ چینی کی
کہا غریب نے جلاد سے دم تعزیر
ٹھہر ٹھہر بہت دلکشا ہے یہ منظر
ذرا میں دیکھ تو لوں تابناکی شمشیر

اور یہی ہوا بھی۔ جنرل ضیاالحق اور اختر عبدالرحمٰن نے اپنی شہادت سے آٹھ برس قبل تابناکی شمشیر دیکھی اور اس کے خوش نما منظر کے ان مضمرات کو سمجھ لیا تھا، جو قوت ربانی، تحمل، استقامت اور بلند حوصلہ کے حامل لوگ ہی دیکھ سکتے اور سمجھ سکتے ہیں۔ جو اپنے اسلاف کے عزم اور تقویٰ سے ناواقف نہ تھے، اور جو راہنمائی اور تقلید کے لیے برصغیر کی دیومالائی تہذیب اور فکر یا مغرب کے بے روح اور مادی فلسفہ حیات کے محتاج نہ تھے، بلکہ جنہیں ہدایت کے لیے قرآن، تقلید کے لیے رسول خدا اور صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کی سیرت مبارکہ اور غور وفکر کے لیے اپنے فلسفہ حیات، اپنی تاریخ، اپنی تہذیب پر مکمل بھروسہ تھا۔ دوسری اقوام کی تاریخ اور ان کے عطا کردہ علوم سے وہ پوری طرح استفادہ کرنے کے اہل تھے، اور انہوں نے ان سے کما حقہ فائدہ اٹھایا بھی، لیکن یہ علوم ان کے لیے جز وایمان کی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی حکمت عملی سے ایک بہت ہی خطرناک دور میں وہ کچھ حاصل کیا، جسے حاصل کرنے کا ان سے قبل تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اور جسے حاصل کرنا اب ان کے بعد ''غیر ضروری'' قرار دے دیا گیا

ہے۔

لیکن ''اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی'' چنانچہ جنرل ضیاالحق اور اختر عبدالرحمٰن نے پاکستان سے وابستہ کسی ایسے معاملہ پر بھی کبھی باطل یا منافقانہ تصورات یا حکمت عملی سے کوئی واسطہ نہیں رکھا، جو نظریاتی اعتبار سے یا دینی اعتقادات کی روشنی میں نا قابل قبول تھے۔ پاکستان اور اسلام کے مفادات کے منافی ہر قوت، ہر تحریک، اور ہر شورش کا انہوں نے ایک دوسرے کے اشتراک سے مقابلہ کیا اور اس میں ذرہ برابر شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ وہ کامیاب ہوئے۔ پاکستان کامیاب ہوا اور اسلامی قوتوں کو اس کامیابی سے ایسی تقویت حاصل ہوئی ہے کہ دنیائے اسلام میں آنے والے زمانہ میں جو کچھ ہونے والا ہے، جو تبدیلیاں رونما ہونے والی ہیں، ان سب کے محرکات اور توجیہات انہی کامیابیوں میں تلاش کیے جائیں گے۔ کاش کی 88-1987ء میں پاکستان کے وزیراعظم اور وزیر خارجہ کو بھی اللہ نے وہی ذہنی صلاحتیں، وہی قلب ونظر عطا کیا ہوتا، جس سے صدر محمد ضیاالحق اور ان کے دفاعی مشیر چیئرمین آف دی جوائنٹ چیفس آف سٹاف جنرل اختر عبدالرحمٰن کو نوازا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر ہمارے جیسے ہیچمدان اور نااہل وکج فہم عرائض نویسوں کی کیا مجال کہ حرف شکایت ادا کریں، یا نکتہ چینی کے مرتکب ہوں، البتہ ''آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے۔''

جو لوگ دو برس گزر جانے کے بعد بھی جمہوریت کی کسی ایک برکت سے بھی پاکستان کو ہمکنار نہیں کر سکے، ان کا تو یہ مقام ہی نہیں کہ وہ کردار اور ایمان کی اعلیٰ ترین صلاحیتوں اور پیشہ ورانہ مہارت اور کارکردگی سے مزین اور پوری وردی میں فوجی کمان کی ذمے داری انجام دیتے ہوئے شہید ہو جانے والوں کا محاسبہ کریں، اور ان کے مدارج کا تعین کریں۔ البتہ سنجیدہ حلقوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ پاکستان کی دفاعی اور جغرافیائی حالات کے بیالیس سالہ پس منظر میں 1980ء سے 1988 تک کی دفاعی حکمت عملی، عسکری تنظیم اور تعمیر نو کا جائزہ منصفانہ انداز میں لیں، اور خود ہی اندازہ لگا لیں کہ دسمبر 1971ء میں ہم ایک ہزیمت یافتہ قوم کے طور پر کس جگہ کھڑے تھے اور آج ہماری دفاعی تنظیم کے بارے میں عالمی مبصرین کے کیا اندازے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ جوش انتقام اور جھنجھلاہٹ سے مغلوب ہو کر یا اپنے نیم پختہ اور برخود غلط تصورات کے زیر اثر موجودہ برسر اقتدار خواتین وحضرات نے وزارت دفاع کے کن کن شعبوں کی شکست وریخت کر ڈالی ہے، یا دفاع اور خارجہ حکمت عملی کے باہمی ربط کو کس حد تک منتشر کر دیا ہے، لیکن جو کچھ دور سے نظر آ رہا ہے، وہ بے حد تشویش ناک ہے۔ اختر عبدالرحمٰن مرحوم نے دفاع کے بہت ہی حساس شعبوں کو اتنا موثر اور فعال کر دیا تھا کہ ہماری خارجہ اور دفاعی حکمت عملی نہایت سائنٹفک اور مربوط انداز میں اپنے جغرافیائی ماحول کی پوری نگران تھی۔ اس کے پاس مسائل اور مراحل سے عہدہ برآ ہونے کے تمام ضروری وسائل تھے، ہماری دفاع اور خارجہ امور کی مشینری حسب ضرورت منصوبے بنانے میں مصروف رہتی تھی اور وہ ہر ناگہاں اور غیر متوقع صورت حال کا سامنا کرنے کی بھی اہل تھی۔ اس نے بہت ہی موثر اور متنوع منصوبے بنانے کی صلاحیت حاصل کر لی تھی اور ان پر نہایت خاموشی سے عمل پیرا ہونے کے فن پر بھی اس کی دسترس ہو گئی تھی۔ ہماری فوج، فضائیہ، اور بحریہ کو جو قوت، تیاری، تربیت اور اعتماد آج حاصل ہے، وہ سب اسی 1980ء سے 1988ء تک کے دور میں حاصل ہوا۔ لیکن اس کے سامنے آج جو مسائل ہیں، اور جن میں برابر اضافہ ہی ہو رہا ہے، وہ گزشتہ ڈیڑھ برس کی حکومتی ''مہربانیوں'' اور ''کرم فرمائیوں'' نے پیدا کیے ہیں۔ یہ صاف نظر آ رہا ہے کہ فوج اس وقت اپنے جن منصوبوں اور جس حکمت عملی، جن تصورات اور جن مقاصد کا بڑی وفاداری اور جانثاری کے ساتھ تحفظ کرنے میں مصروف ہے، اور جن کی بقا اور تحفظ موجودہ سیاسی ماحول میں ہر آنے والے دن زیادہ سے زیادہ دشوار ہوتا جا رہا ہے، وہ سب وہی ہیں، جو دو شہید جنرلوں نے شب وروز کی محنت اور غور وفکر سے ترتیب دیے تھے اور جن کو آٹھ سال سک برابر سنوارا اور بہتر سے بہتر بنایا جاتا رہا۔ بہت سے ایسے راز رہے ہوں گے، جن سے صرف ان دونوں جرنیلوں کے کان اور

آنکھیں آشنا ہوں گی، اور جوان کے سینہ میں مدفون انہی کے ساتھ رخصت ہو گئے ہوں گے، لیکن وہ منصوبے اور کامیابیاں، جو یہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں، مجھے یقین ہے کہ تاحال فوج ان سے فائدہ اٹھانے پر قادر ہے۔ کیوں کہ یہ سب منصوبے قابل عمل ہیں۔ یہ پاکستان کے دفاعی مسائل اور امکانات کو پوری طرح سمجھ کر حقیقت پسندانہ انداز میں مرتب کیے گئے ہیں۔ یہی ان دو شہیدوں یعنی جنرل محمد ضیاالحق اور جنرل اختر عبدالرحمٰن کا پاکستان اور عساکر پاکستان کے لیے اپنے پیچھے چھوڑا ہوا عطیہ ہیں۔ وہ اول و آخر مسلمان اور پاکستانی تھے۔ اللہ ان کے درجے بلند کرے اور ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم حقیقت آشنا اور جوہر شناس ہو سکیں، اور اس واضح اشارے کو سمجھ سکیں کہ

زمانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے
انہی کی خاک میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری

ابن الحسن
دسمبر ۱۹۹۲ء